معیار: علمی وتحقیقی مجلّہ، شعبۂ اُردو، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد، جلد:۲، شمارہ:۱ جنوری-جون ۲۰۱۰ء

تبصراتی مقالہ

جناح: اتحاد سے تقسیم تک

Jinnah: India-Partition-Independence

By: Jaswant Singh, Rupa & Company, New Delhi, 2009, Pages:669, Rs:1395/-

اُردو ترجمہ: فرحت عباس، بہ اشتراک: مسعود ہاشمی، سہیل انجم، اسماء سلیم۔ نظر ثانی: پروفیسر اختر الواسع

روپا اینڈ کمپنی، نئی دہلی، ۲۰۰۹ء، قیمت: ۴۹۵

فتح محمد ملک*

بھارت کے سرکردہ سیاسی مدبر جناب جسونت سنگھ کی اِس کتاب کی اشاعت ہنگامہ خیز ثابت ہوئی۔ یہ کتاب بانیِ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی تحسین اور قیامِ پاکستان کی تردید میں لکھی گئی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اِس کی اشاعت کے فوراً بعد برعظیم بڑے بڑے شہروں میں رونمائی کی تقریبات منعقد ہوئیں اور بعدازاں اِس کی پذیرائی کی تقریبات کا انعقاد بڑے تسلسل اور تواتر کے ساتھ ہوتا چلا آ رہا ہے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کی پاکستان شاخ کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والی تقریبات میں جناب جسونت سنگھ نے اپنے موقف کی وکالت کرتے وقت چند ایسے بیانات دیئے ہیں جو برسوں زیرِ بحث رہیں گے۔ ایسا ہی ایک بیان یہ ہے کہ تقسیمِ ہند کو تو اَب نہیں مٹایا جا سکتا مگر اِس کے نتائج کو ختم کیا جا سکتا ہے: "While partition can't be undone but its consequence can be undone"! جاننا چاہیے کہ تقسیمِ ہند کا نتیجہ (Consequence) قیامِ پاکستان ہے۔ ایسے میں جناب جسونت سنگھ کا یہ قول کہ تقسیمِ ہند تو قائم رہے گی مگر اُس کا ناگزیر نتیجہ مٹایا جا سکتا ہے، کیا معنی رکھتا ہے؟ زیرِ نظر کتاب کے سیاق وسباق میں تو اِس فقرے کا مطلب وہی ہے جو گاندھی جی کی اِس پیش کش کا تھا کہ اگر قائداعظم جداگانہ مسلم قومیت کے نظریے کو ترک کر دیں تو وہ مسلمانوں کو علاقائی خودمختاری دینے پر تیار ہیں۔ قائداعظم نے اِس پیش کش کو فوراً ٹھکرا دیا تھا۔ اُن کا استدلال یہ تھا کہ جداگانہ مسلمان قومیت (دوقومی نظریہ) ہی برعظیم میں جداگانہ مسلمان مملکت کی پائیدار بنیاد ہے۔ اس لیے اس نظریاتی بنیاد کو منہدم کرنے کا تصور ہی بے بنیاد ہے۔ ہمارا آج کا المیہ یہ ہے کہ کل جس بات کو قائداعظم نے سرے سے غور کے قابل ہی نہ سمجھا تھا آج ہمارے سیکولر مُلّا اُس پر غور وفکر میں مصروف ہیں۔ آیئے ہم بھی اِس غور وفکر میں شریک ہو کر زیرِ نظر کتاب پر ایک تنقیدی اور تجزیاتی نظر ڈالیں۔

* سرپرست: معیار؛ ریکٹر، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد۔

قائداعظم یا مسٹر جناح؟

گزشتہ چند برس سے قائداعظم کو پھر سے مسٹر جناح بنانے کی مہم زور پکڑتی جارہی ہے۔ بانیِ پاکستان، قائداعظم محمد علی جناح کی زندگی ایک مسلسل ارتقاء سے عبارت ہے اور وہ عمر بھر اپنے علم و عمل اور اپنے مشاہدات و تجربات کی روشنی میں فکری و نظریاتی ارتقاء کی راہوں پہ گامزن رہے ہیں۔ اُن کے نظریاتی ارتقاء کی تکمیلی شان اقبال کے تصوّرِ پاکستان کو تحریکِ پاکستان میں ڈھال کر اپنی قیادت میں اِس عوامی جمہوری تحریک کو قیامِ پاکستان کی منزل سے ہمکنار کرنے میں جلوہ گر ہے۔ مملکتِ پاکستان کو دُشمن کی نگاہ سے دیکھنے والی قوتیں قائداعظم کے شخصی اور نظریاتی ارتقاء سے پھوٹنے والی ذہنی پختگی اور دانشمندانہ سیاسی حکمتِ عملی کی تحسین کی بجائے تردید کی خوگر ہیں۔ وہ بانیِ پاکستان کی ترقی پسند حکمت اور کرشمہ کار حکمتِ عملی کو اُن کی رجعت پسندی سے تعبیر کرتی ہیں۔ پیشتر ازیں مغربی اور بھارتی یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور محقق قیامِ پاکستان کو نہرو یا پٹیل یا پھر خود قائداعظم کی غلطی سے تعبیر کرنے کی خاطر دُور کی کوڑیاں لانے میں مصروف رہا کرتے تھے۔ اب اِس گروہ میں بھارتی سیاستدان بھی ایک مرتبہ پھر شامل ہوگئے ہیں۔ اِس کی تازہ ترین مثال بھارت کے سابق وزیرِ دفاع اور سابق وزیرِ خارجہ جسونت سنگھ کی کتاب "JINNAH: India-Partition-Independence" ہے۔ پاکستان میں اِس کتاب کی زبردست پذیرائی کا مسلسل اور متواتر اہتمام کیا جارہا ہے۔ مترجمین کے ایک بورڈ نے اِس کتاب کو حیرت انگیز تیزی کے ساتھ اُردو میں بھی منتقل کر دیا ہے۔ صداقت یہ ہے کہ یہ کتاب بانیِ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی سیرت و کردار کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے بہانے قیامِ پاکستان کی مذمت میں لکھی گئی ہے۔ جسونت جی کا کہنا ہے کہ قائداعظم تو آخر دم تک اکھنڈ بھارت (متحدہ ہندوستانی فیڈریشن) کے خواب کو عملی جامہ پہنانے میں سرگرمِ عمل رہے تھے مگر انڈین نیشنل کانگرس کی قیادت اور بالخصوص پنڈت نہرو نے اُن کی ایک نہ چلنے دی اور یوں پنڈت نہرو کی غلطی سے پاکستان قائم ہوگیا۔ اُن کے خیال میں پاکستان کا قیام اجتماعی انسانی حماقت (Collective Human Folly-p6) کا نتیجہ ہے۔ دہلی یونیورسٹی کی پروفیسر اجیت جاوید تو اپنی حالیہ کتاب "Secular and Nationalist Jinnah" میں جسونت سنگھ پر بھی بازی لے گئیں۔ انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قائداعظم کو اپنی سیاسی زندگی کا سب سے بڑا صدمہ قیامِ پاکستان کی صورت میں پیش آیا تھا اور بہت جلد یہی جان لیوا صدمہ اُن کی وفات کا باعث بن گیا تھا۔

اِس استدلال کے بین السطور لکھنے والوں کی یہ تمنّا پوشیدہ ہے کہ قیامِ پاکستان کی غلطی کو ''درست'' کیے بغیر برعظیم میں حقیقی معنوں میں امن، آزادی اور خوشحالی کا سورج طلوع نہیں ہوسکتا۔ اپنی اِس تمنا کو پورا کرنے کی خاطر ایسے تمام دانشور اور سیاستدان تاریخی حقائق کو مسخ کرنے اور اہم ترین سیاسی تصوّرات اور واقعات کو تاریخ سے حذف کر دینے پر مجبور ہیں۔ میں اپنی اس تحریر میں اُن عہد آفریں تصوّرات اور واقعات کے تناظر میں جناب جسونت سنگھ کی کتاب کو زیرِ بحث لایا ہوں۔

تحریکِ پاکستان کے تین اہم ترین سنگ ہائے میل ہیں۔ اوّل: ۱۹۳۰ء میں اقبال کا تصورِ پاکستان۔ دوم: ۱۹۴۰ء میں قراردادِ پاکستان۔ سوم: ۱۹۴۷ء میں قیامِ پاکستان۔ اپنے ہمنوا سیاسی دانشوروں یا دانشور سیاستدانوں کی مانند جسونت سنگھ جی اپنی کتاب میں تصورِ پاکستان اور تحریکِ پاکستان کو سرے سے زیرِ بحث ہی نہیں لاتے۔ وہ فقط مذاکرات کی اُس میز کے گرد گھومتے رہتے ہیں جو انگریز سرکار نے اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر ہندوستان کو متحد رکھنے کی خاطر بچھا رکھی تھی۔ اِس گول میز کے اِرد گرد اُٹھنے بیٹھنے اور بولنے چالنے کی مختلف روئیدادوں کو وہ اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے کاٹ پیٹ کر پیش کرنے کو کافی سمجھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ اُن کمروں سے باہر نکل کر جہاں کبھی

گول میز کے گرد اور کبھی میز سے ذرا سا ہٹ کر بچھے ہوئے صوفوں پر یہ سیاسی مذاکرات ہوتے رہے برطانوی ہند کے زمین و آسمان کو بھی دیکھتے تو وہ اُس عوامی جمہوری تحریکِ پاکستان کو بھی دیکھ پاتے جو شاعرِ مشرق اور مفکرِ پاکستان علامہ اقبال کے تصورِ پاکستان سے پھوٹی تھی۔ تب یہ حقیقت اُن پر روشن ہو جاتی کہ پاکستان نہ کسی ایک ہندو یا مسلمان لیڈر کی غلطی سے وجود میں آیا ہے اور نہ قیامِ پاکستان ''اجتماعی انسانی حماقت'' کا ثبوت ہے۔ اِس کے برعکس پاکستان کا قیام ایک ایسی جمہوری تحریک کا نتیجہ ہے جس کی جڑیں برعظیم کے مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ سے ہوتی ہوئی تیرہ سو سال پہلے کے مدینۃ النبیؐ تک پھیلی ہوئی ہیں۔ آیئے قیامِ پاکستان تک اپنے تاریخی سفر کے اُن تین سنگ ہائے میل کو پہچاننے کی کوشش کریں جن سے جسونت سنگھ جی نے کنی کاٹ کر گزر جانے ہی میں عافیت سمجھی ہے۔

اوّل: خطبۂ الہ آباد۔ علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء میں عین اُس وقت پاکستان کا تصور پیش کیا تھا جب لندن کی پہلی گول میز کانفرنس ایک فاتحانہ شان کے ساتھ مسلمانوں سے جداگانہ انتخاب کا حق بھی چھین کر متحدہ ہندوستانی فیڈریشن کے آئینی خاکے پر متفق ہو چکی تھی۔ ایسے میں الہ آباد کے مقام پر مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں اقبال نے یہ کہہ کر کہ برصغیر کے مسلمان ایک اقلیت نہیں بلکہ ایک قوم ہیں، مسلمانوں کی سیاست کو اقلیت کی تنگ ندی سے باہر نکال کر قومی آزادی کا بحرِ بیکراں بنا دیا تھا۔ چوں کہ مسلمان ایک قوم ہیں، ایک جداگانہ اور منفرد قوم اِس لیے انہیں اپنی اکثریت کے علاقوں میں اپنی آزاد اور خودمختار مسلمان مملکتیں قائم کرنے کا حق حاصل ہے۔ ایک محکم فلسفیانہ استدلال کے ساتھ انھوں نے اکثریتی اقلیتی سیاست کا رُخ بدل کر رکھ دیا تھا۔ اب مسلمان ایک ایسی بے بس اقلیت نہ رہی تھی جو ہندو اکثریت سے حقوق اور تحفظات کی بھیک مانگنے پر مجبور ہو۔ اب اِس اقلیتی سیاست پر خطِ تنسیخ کھینچ کر رکھ دیا گیا تھا۔ اب اُن کے ہاں جداگانہ مسلم قومیت کی بنیاد پر جداگانہ مسلم مملکتوں کے قیام کی سیاسی جدوجہد کا آغاز ہو گیا تھا۔ یہ نیا سیاسی نصب العین نہ انگریز سرکار کو پسند آیا تھا اور نہ ہندو اکثریت کو۔ برطانیہ کے وزیراعظم نے اقبال کے اِس تصورِ پاکستان کو ایک ایسی شرارت قرار دیا تھا جس نے اُن کے ''سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا تھا۔'' اِس پر علامہ اقبال نے برطانوی وزیرِ اعظم کو یوں للکارا تھا:

> "The Prime Minister of England apparently refuses to see that the problem of India is international and not national. Obviously he does not see that the model of British democracy cannot be of any use in a land of many nations."[۲]

درج بالا استدلال نے برطانوی ہند کی سیاست کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ اقبال نے برطانوی ہند کو ایک نہیں کئی قوموں کا مسکن قرار دیا۔ نتیجہ یہ کہ برطانوی ہند کا سیاسی مسئلہ آن کی آن میں قومی کی بجائے بین الاقوامی بن گیا۔ اقبال کے اِس موقف نے برطانوی سامراج کو ایک بہت بڑی مشکل میں ڈال دیا۔ قوموں کے حقِ خودارادیت کے بین الاقوامی طور پر مسلمہ اصول کی رُو سے برطانوی ہند کی متعدد قوموں میں سے ہر قوم کو اپنا مستقبل اپنے ہاتھوں میں لینے اور اپنی قومی زندگی کی صورت گری خود کرنے کا حق زیرِ بحث آ گیا۔ برعظیم کی دیگر اقوام کی بات فی الوقت ملتوی کرتے ہوئے ہم اپنی قومی تحریکِ آزادی کے اِس اہم ترین سنگِ میل کی اہمیت کو سمجھنے کی کوشش کریں تو یہ جاننا کچھ مشکل نہیں رہتا کہ یہ وہ سنگِ میل ہے جہاں پہنچ کر برطانوی ہند کے مسلمانوں نے اقلیتی سیاست کی اندھی گلی سے نکل کر شاہراہِ پاکستان پر قدم رکھا تھا۔

دوم: ہماری تحریکِ آزادی کا دوسرا سنگِ میل ہے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی قراردادِ پاکستان۔ یہ وہ لمحہ ہے جب اسلامیانِ ہند نے اقبال

کے تصورِ پاکستان کو قراردادِ پاکستان میں ڈھالتے ہوئے عہد کیا تھا کہ ہم متحدہ ہندوستانی فیڈریشن کے ہر آئینی خاکے کو رد کرتے ہیں اور عہد کرتے ہیں کہ ہم برصغیر کے اُن علاقوں میں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں الگ، آزاد اور خودمختار مملکتیں قائم کریں گے۔ یہ وہ سنگِ میل ہے جہاں سے تحریکِ پاکستان کا آغاز ہوتا ہے۔ سن چالیس میں اقبال کے تصورِ پاکستان کو آل انڈیا مسلم لیگ کے سیاسی منشور کی صورت بخشی گئی اور سن بیالیس میں قائداعظم نے اقبال کے ساتھ اپنی پرائیویٹ اور خفیہ خط و کتابت کو Letters of Iqbal to Jinnah کے عنوان سے قوم کے سامنے پیش کر دیا۔ اِس کتاب کے ''حرفِ اوّل'' میں انھوں نے اِن خطوط کی تاریخی اہمیت پر روشنی ڈالتے وقت اِس حقیقت کا اعتراف فرمایا تھا کہ اقبال کے نظریات کی روشنی میں انھوں نے بھی بالآخر مسلمان قومیت کی بنیاد پر آزاد اور خودمختار مسلمان مملکتوں کے قیام کو ہی راہِ نجات پایا ہے:

> "Iqbal's views had finally led me to the same conclusions as a result of careful examination and study of the constitutional problems facing India, and found expression in due course in the united will of Muslim India as adumberated in the Lahore resolution of the All-India Muslim League, popularly known as the "Pakistan Resolution," passed on 23rd March, 1940."[۳]

درج بالا سطروں میں خود قائداعظم نے ۱۹۴۰ء کی قراردادِ پاکستان کو اسلامیانِ ہند کی اجتماعی رائے کا سیاسی اظہار بھی قرار دیا ہے اور ساتھ ہی یہ بتانا بھی اشد ضروری سمجھا ہے کہ مسلمانوں کی یہ اجتماعی رائے علامہ اقبال کے افکار کا فیضان ہے۔

سوم: قیامِ پاکستان۔ جسونت سنگھ اور اُن کے ہمنوا قیامِ پاکستان کو غلطی اور حماقت ثابت کرتے وقت تصورِ پاکستان اور تحریکِ پاکستان کو اپنے مباحث کے دائرے سے خارج کر دیتے ہیں۔ وہ خوب سمجھتے ہیں کہ پاکستان ایک فرد نے نہیں ایک قوم نے قائم کیا ہے۔ ہماری اِس قوم نے ٹینکوں پر بیٹھ کر، جنگی طیاروں پر اُڑ کر، اندھی قوت سے پاکستان کسی پر مسلط نہیں کیا۔ پاکستان اُس عوامی جمہوری تحریک کی عطا ہے جس کی قیادت مسٹر جناح نے نہیں بلکہ قائداعظم محمد علی جناح نے فرمائی تھی۔ اِس تحریک کے خواب و خیال کو اپنے دل و دماغ میں بسا کر، اَن تھک محنت، بے پناہ ایثار اور ناقابلِ تسخیر عزم و استقلال کے ساتھ اِس تحریک کی قیادت کا حق ادا کر کے ہی مسٹر جناح مسلمانوں کے قائداعظم اور دُنیا کے بے مثال اور لافانی رہنما قرار پائے تھے۔ آج برصغیر میں ایک نئے برہمن سامراج کے خواب دیکھنے والے دانشور اور سیاستدان ہمارے قائداعظم کو پھر سے مسٹر جناح بنا کر اُن سے بانیِ پاکستان کا اعزاز چھین لینا چاہتے ہیں اور ہم سے ہمارا پاکستان!

بھارت کی سامراجی وحدت کا نوحہ

جناب جسونت سنگھ کی کتاب تقسیمِ ہند کا نوحہ ہے۔ موصوف قیامِ پاکستان کو بھارت ماتا کی سفّاکانہ چیر پھاڑ (Cruel Vivisection) سے تعبیر کرتے ہیں۔ حقیقت اِس کے برعکس ہے۔ برصغیر کی سامراجی وحدت کا ٹوٹنا برصغیر کی متعدد قوموں کی آزادی اور خود مختاری کی نوید ثابت ہوا۔ یہ تاریخی عمل نوحۂ غم کی بجائے نغمۂ شادی کا طلبگار ہے۔ زمانۂ قدیم ہی سے برصغیر کے متعدد ممالک میں متعدد قومیں آباد چلی آ رہی ہیں۔ اِن قوموں اور اِن ممالک کو ہمیشہ کسی نہ کسی سلطنت کے قاہر و جابر حکمران نے فتوحات کے ذریعے وحدت بخش رکھی

تھی۔ سلطنتِ برطانیہ سلطنتِ مغلیہ کی جانشین تھی۔ ہر دو سلطنتوں کے پیشرو آریائی،، یونانی، ایرانی اور وسط ایشیائی سلاطین اندھی قوّت سے شہروں اور ملکوں کو روندتے ہوئے فاتح کی حیثیت سے تخت نشین ہوئے تھے۔

برعظیم کی گزشتہ چار ہزار پانچ سو دس برس کی تاریخ میں پاکستان کُل سات سو گیارہ برس تک ہندوستان کا حصہ رہا۔ اِن میں سے بھی پانچ سو بارہ برس مسلمانوں کے دورِ حکومت کے ہیں اور لگ بھگ سو برس بُدھسٹ اور کرسچین ادوارِ حکومت پر مشتمل ہیں۔ اِس طویل وقفۂ زماں میں بھی برعظیم بالعموم مختلف اور آپس میں متصادم و متحارب راج دھانیوں میں منقسم رہا۔ آج جن علاقوں پر پاکستان مشتمل ہے وہ تاریخ کے کسی دور میں بھی بھارت کا حصہ نہیں رہے۔ بلادِ اسلامیۂ ہند (United States of Muslim India) اور برطانوی ہند کے ادوارِ حکومت کی بات الگ ہے۔ جناب اعتزاز احسن نے اپنی کتاب بعنوان "The Indus Saga" میں مذکورہ بالا تاریخی اور جغرافیائی حقائق سے برآمد ہونے والی پاکستان کی الگ، ممتاز اور منفرد جغرافیائی اور تہذیبی اکائی کی کہانی بڑے محکم استدلال کے ساتھ بیان کی ہے۔ اِن حقائق کی روشنی میں برطانوی سلطنت کے خاتمہ پر جمہوری عمل سے وجود میں آنے والی مملکتِ پاکستان کا قیام برصغیر کی محکوم قوموں کی آزادی کی نوید ہے نہ کہ برطانوی ہند کی سامراجی وحدت کی ٹوٹ پھوٹ کا المیہ۔

یہ حقیقت ہمیشہ پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ پاکستان اسلامیانِ ہند کی اجتماعی رائے سے وجود میں آیا تھا۔ جب انتخابات میں ووٹ کی پرچی کے استعمال سے اسلامیانِ ہند کی بھاری اکثریت نے قیامِ پاکستان کے حق میں فیصلہ دے دیا تو برطانوی حکومت اور انڈین نیشنل کانگرس ہر دو نے اِس اجتماعی فیصلے کو بدلنے کے لیے کیبنٹ مشن بھیج کر سامراجی حکمتِ عملی کا بھرپور استعمال کیا مگر اسلامیانِ ہند کے قائداعظم نے بالآخر اِس سامراجی حکمتِ عملی کو برطانوی حکومت کے خلاف راست اقدام کر کے خاک میں ملا دیا۔ جسونت سنگھ اپنی کتاب میں کیبنٹ مشن کے ساتھ قائداعظم کے مذاکرات پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

> The Cabinet Mission informed Jinnah, in the course of their talk with him, that as power could be transferred only to one body, therefore, the establishment of two centers in India could not be conceived under 'Constitional law and practice'. The Mission also drew his attention to the need for a single centre being vital for security reasons."[۴]

درج بالا سطور میں کیبنٹ مشن کا استدلال قابلِ غور ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ آزاد برعظیم میں طاقت کے دو مراکز کا قیام اِس لیے ممکن نہیں کہ سلامتی کے تقاضے فقط ایک مرکز یعنی متحدہ ہندوستان ہی سے پورے ہو سکتے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کس کی سلامتی (Security) کے تقاضے؟ جواب میں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مغربی سامراج کی سکیورٹی کے تقاضے۔ پاکستان کے قیام کے حق میں مسلمان عوام کا ناقابلِ تسخیر فیصلہ برطانوی حکومت کے لیے اِس لیے ناقابلِ قبول تھا کہ اُسے مستقبل کے آزاد ایشیاء میں مغربی سامراج کو درپیش ممکنہ خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے بھارت کی سامراجی وحدت پر انحصار ناگزیر نظر آنے لگا تھا۔ آج بھی مغربی سامراج اُسی استدلال کے ساتھ پاکستان کی آزادی اور خودمختاری کو خطّے میں اپنی سلامتی (Security) کے لیے خطرہ سمجھتا ہے اور کوشاں ہے کہ پاکستان بھارت کی ایک تابع فرمان

ریاست بن کر رہ جائے اور نیٹو ہائی کمان کے احکامات کی بجا آوری کرتے ہوئے خطّے میں بھارت کی بالادستی قائم کرنے کی مغربی سامراجی تمنّاؤں کو بَر لائے۔ آج ہمیں پہلے سے کہیں بڑھ کر قائداعظم کی فکری صلابت اور نظریاتی استقامت کو مشعلِ راہ بنانے کی ضرورت ہے۔ آج یہ جاننا ہم پہ لازم ہے کہ بھارت کی سامراجی وحدت کو برقرار رکھنے کے لیے کیبنٹ مشن کے درج بالا استدلال کو قائداعظم نے کس محکم استدلال کے ساتھ رَد کر دیا تھا:

> "To the Cabinet Mission, when interviewed for the second time on 16 April 1946, Jinnah declard that the unity of India was a myth. Earlier he had told Sir Stafford Cripps that the Muslims had a different conception of life from the Hindus and there was no solution but adivision of India."[۵]

ہندوستان کی سامراجی وحدت کی اِس تردید (the unity of India was a myth) کی جڑیں برعظیم کی سیاسی تاریخ میں بہت گہری ہیں۔ جب ایک برطانوی سول سرونٹ لارڈ ہیوم نے ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی بُنیاد رکھی تو سرسید احمد خان نے اِس کی پُرزور مذمت کی۔ انھوں نے اگر ایک طرف مسلمانوں کو اِس اینگلو انڈین تنظیم سے دُور رہنے کا مشورہ دیا تو دوسری طرف انگریز حکمرانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس صداقت کا اثبات کیا کہ برطانوی ہند ایک ملک نہیں بلکہ ایک برِّعظیم ہے (India is a continent; it is not a small and homogeneous country like England)۔ اپنے ''آخری مضامین'' میں سرسیّد نے بہ اعادہ و تکرار اِس استدلال کو آگے بڑھایا ہے کہ برِّعظیم ہند میں ایک قوم نہیں بلکہ کئی قومیں آباد ہیں۔ بیسویں صدی میں اپنے خطبہ الہ آباد میں علامہ اقبال نے اِسی خیال کو پیش کرتے ہوئے ہندوستان کے مسئلے کو قومی کی بجائے بین الاقوامی مسئلہ قرار دیا۔ ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے مطالبہ کیا کہ برطانوی ہند میں آباد ہر قوم کا حق خودارادیت تسلیم کیا جائے اور برطانوی جمہوریت کا ماڈل برطانوی ہند میں نافذ کرنے سے پہلے ہندوستان کی ہر قوم کو اپنے اپنے مُلک میں آزادی اور خودمختاری کا حق دیا جائے۔ قائداعظم نے آل انڈیا مسلم لیگ کے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کے اجلاسِ لاہور میں اِسی صداقت کو باندازِ دِگر بیان کرتے ہوئے برطانوی سرکار کو باور کرانا چاہا تھا کہ: "The problem of India is manifestly an international one."۔ عوام کی بھرپور قوّت سے تحریکِ پاکستان کو کامیابی سے ہمکنار کرتے ہی جب بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح پر برطانوی حکومت نے ہندوستان کو متحد رکھنے کے لیے زبردست دباؤ ڈالا تب بھی بانیِ پاکستان نے اسی صداقت کا برملا اظہار فرمایا:

The unity of India was a myth.

جسونت سنگھ کی زیرِ نظر کتاب ہندوستان کی وحدت کے اِس دیومالائی افسانہ و افسوں (Myth) کے منتشر ہو کر رہ جانے کا نوحہ ہے۔ جسونت سنگھ جی کو اِس نوحہ خوانی سے تھوڑا سا وقت نکال کر اِس حقیقت پر غور کرنا چاہیے کہ آزادیٔ ہند کی مختلف اور متحارب تحریکوں کا زمانہ وہ ہے جب اندھی قوت سے سلطنتوں کی تعمیر کا دور رفت گزشت ہو چکا تھا۔ یورپ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ جب آسٹرو ہنگیرین ایمپائر ختم ہوئی تھی تو اِس سلطنت کی ٹوٹ پھوٹ سے یورپ کے متعدد آزاد اور خودمختار ممالک برآمد ہوئے تھے۔ آج یورپ کے اِن تمام برادر ملکوں میں

ایمپائر کے خاتمے کو آزادی اور حریّت کے دور کا طلوع قرار دیا جاتا ہے۔ اِن میں سے کسی ملک کا کوئی باشندہ بھی یہ نہیں کہتا کہ آسٹرو ہنگیرین ایمپائر کا خاتمہ یورپ ماتا کی چیر پھاڑ ہے۔ یورپ کی یہ تمام قومیں تقسیم اور ٹوٹ پھوٹ کی نوحہ خوانی کی بجائے آزادیٔ انساں اور سلطانیٔ جمہور کے جشن مناتی ہیں۔ کیا ہم یورپ سے اتنا بھی نہیں سیکھ سکتے؟

اہم ترین تاریخی حقائق سے چشم پوشی

جناب جسونت سنگھ نے زیرِ نظر کتاب میں اپنے سیاسی بیانیہ کے دوران انتہائی دُوررس نتائج کے حامل تاریخی واقعات اور سیاسی تحریکوں کو نظرانداز کرنے کی روش اپنائی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ سہوِ نظر نہ ہو بلکہ سوچی سمجھی حکمتِ عملی ہو۔ واقعات وحقائق کے اِس انتخاب کا مقصد مفیدِ مطلب نتائج کا حصول ہے۔ اِس طرزِ عمل کی بہترین مثال کتاب کے پہلے باب میں شملہ وفد اور آل انڈیا مسلم لیگ کے آغاز کے مباحث ہیں۔ اِس باب میں مسلمانوں کی الگ سیاسی تنظیم کے بنیادی محرکات وعوامل کو یکسر نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ یہاں اُس زمانے میں سیاسی منظر پر چھائی ہوئی جارحانہ ہندو احیائیت کی مسلمان دشمن تحریک کے احوال ومقامات کو بحث سے خارج کر دیا گیا ہے۔ اپنی کتاب کے آخری باب بعنوان In Retrospect (بازدید) میں وہ جداگانہ مسلمان قومیت کی تعمیر کے موضوع پر اپنی خیال آرائی کا آغاز یوں فرماتے ہیں:

> ''میں ایسا سوچتا ہوں کہ یہ اہم سوال پیدا ہی نہیں ہوتا اگر ۱۹۰۶ء کا شملہ نمائندہ وفد ہندوستان کے وائسرائے سے ۱۰۲ سال قبل نہیں ملا ہوتا۔ آخر یہیں سے تو محمد علی جناح کے اس دعوے کا سفر کہ 'مسلمان ایک الگ قوم ہیں' شروع ہوا۔ جناح نے اس دعوے کو نظریاتی طور پر اور اپنی خواہش کے مطابق حقیقت میں بدلا۔ انھوں نے ایک ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔''[۶]

اگر جسونت سنگھ اپنی تفتیش کا آغاز ۱۹۰۶ء کی بجائے ۱۹۰۵ء سے کرتے تو درست جواب پر پہنچ سکتے تھے۔ یہ وہ سال ہے جس میں اقبال ملائیت اور برہمنیت کو مٹا کر ایک نیا شوالہ تعمیر کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے مگر رابندر ناتھ ٹیگور برطانوی ہند میں آریہ ورت اور سودیشی سماج کے قیام کے اہتمام میں سرگرم تھے اور آروبندو گھوش، بنکم چندر چٹرجی کے ناول 'آنند مٹھ' کے عکس پر 'بھوانی مندر' لکھنے میں مصروف تھے۔ جس وقت اقبال برہمن کو اپنے صنم کدے سے پرانے بت باہر نکال پھینکنے کی تلقین کر رہے تھے عین اُس وقت ہندو احیائیت کی تحریک آروبندو گھوش اور ٹیگور کے زیرِ اثر نسلی برتری کا ایک نیا بُت تراش رہی تھی۔ ۱۹۰۵ء کی تقسیمِ بنگال نے ہندو احیائیت کی اس تحریک کو ایک خطرناک جارحانہ رنگ دے دیا تھا۔

۱۹۰۵ء میں خالص انتظامی بنیادوں پر بنگال کی تقسیم پر ہندوؤں کے منفی ردِعمل نے ہندوستان کی سیاسی اور تہذیبی زندگی میں فرقہ واریت کی خلیج کو ناقابلِ عبور بنا دیا تھا۔ ہندو احیائیت جو ابھی کل تک محض ایک علمی موشگافی اور مذہبی مناظرہ بازی تک محدود تھی، اب ایک باقاعدہ سیاسی تحریک میں ڈھل گئی تھی۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ شیواجی کو اِس تحریک کا سرچشمۂ فیضان سمجھا جانے لگا تھا۔ یہ عجب اتفاق ہے کہ اقبال ۱۹۰۵ء میں اپنے علمی سفر پر یورپ روانہ ہوئے اور ٹیگور عملی سیاست میں آئے۔ تقسیمِ بنگال کی مذمت میں ٹیگور نے ترانے لکھے، ہڑتالیں کرائیں، احتجاجی جلوسوں کی قیادت کی اور راکھی بندھن کی سی خالص ہندوانہ رسومات کو پہلی مرتبہ سیاسی رنگ دیا۔ اروبندو گھوش نے ۱۹۰۶ء میں 'بندے ماترم' کے نام سے اپنا انتہاپسند ہفتہ وار اخبار شائع کرنا شروع کیا۔ یہ بات بہت معنی خیز ہے کہ اروبندو گھوش نے اپنے اِس

اخبار کا نام بنکم چندر چٹرجی کے ناول 'آنند مٹھ' سے 'بندے ماترم' کے مسلمان دشمن ترانے سے لیا تھا۔

اخبار 'بندے ماترم' نے رام کرشن، ویویکانند اور بنکم چندر چٹرجی کے جارحانہ تصورات کو ہندو قوم پرستی کی انتہا پسند تحریک کی فکری اساس بنایا تو اِس جارحیت کا رُخ مسلمانوں کی طرف پھر گیا۔ شکتی کی منظّم قوت سے ہندوستان میں آریہ ورت قائم کرنے کا تصور عام ہوا۔ شکتی کے تصور کی خالص شکتی اور ملیچھ شکتی میں تقسیم ہوئی تو بقول لیونارڈ، آر۔ گورڈن مسلمانوں کو ملیچھ شکتی (ناپاک قوّت) قرار دے کر ہندوستانی قومیت کے دائرے سے خارج قرار دیا گیا:

> "It would seem from both internal evidence and wider information about Aurobindo's thought that he either completely ignored the Muslims or would include them with Melecha shaktis. In doing so, he was following the implicit or explicit anti-Muslim line of the Hindu nationalists and religions ideologues of the later ninteenth century."[۷]

اسلام کی وسیع النظر اور انسان دوست آفاقی تعلیمات کی روشنی سے اپنے دل و دماغ کو منوّر کر کے اقبال نے کہا تھا:

شکتی بھی، شانتی بھی، بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

مگر بنگال کی انتظامی تقسیم کے ردِعمل میں سیاسی رہنما ہی نہیں تہذیبی زعما بھی برصغیر میں محبت کا ایک نیا شوالہ آباد کرنے کی بجائے ایک ایسے قدیم آریہ ورت کے قیام کا خواب دیکھنے لگے، جس میں شانتی اور پریت صرف ہندو نسل کے لیے وقف ہو اور خالص شکتی، ملیچھ شکتی پر غلبہ حاصل کر سکے۔ تقسیمِ بنگال کا اعلان گویا ایک بھونچال تھا جس نے ہندوستانی زندگی کے باطن میں گرجنے والے منافرت کے لاوے کو زندگی کی خارجی سطح پر لا پھینکا تھا۔ ایسے میں قدرتی طور پر مسلمان زعماء نے برصغیر کے مسلمانوں کے اِس لاوے میں جل کر راکھ ہو جانے کے امکانات کا گہرا تجزیہ کیا اور اِس تجزیے سے برآمد ہونے والی سچائی کی تلاش میں انگریز حکومت کے دروازے پر دستک دی۔ انگریز حکومت اور شملہ وفد میں شامل مسلمان زعماء کے درمیان موجود خیر سگالی کے جذبات کے زیرِ اثر اِس وفد کی معروضات پر برطانوی حکومت نے انصاف کی نظر ڈالی، بیشتر مطالبات منظور ہوئے اور یوں بعد ازاں اِسی وفد کے اراکین نے مسلمانوں کی سیاسی تنظیم کا فرض سنبھالا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے دورِ اوّل کی اِس قیادت نے برطانوی ہند کے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ اور توسیع میں شاندار تاریخی خدمات سرانجام دیں۔ اِن زعماء نے یہ کارنامہ تصادم کی نہیں بلکہ تعاون کی حکمتِ عملی کی بدولت سرانجام دیا تھا۔

شملہ وفد میں شریک بانیانِ مسلم لیگ پر طنز کیا گیا ہے کہ وہ حکومتِ وقت کے پسندیدہ زعماء تھے۔ طنز کرنے والوں کو یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ انڈین نیشنل کانگرس کی بُنیاد برطانوی افسر شاہی کے ایک کارندے نے رکھی تھی اور کانگرس کے افتتاحی اجلاس میں برطانوی سرکار سے غیر مشروط وفاداری کی ''جرأت مندانہ'' قرارداد منظور کی گئی تھی۔ اُس زمانے کے حالات کا حقیقت پسندی سے جائزہ لیا جائے تو اِس ناگزیر نتیجے پر پہنچنا قرینِ انصاف ہے کہ انڈین نیشنل کانگرس اور آل انڈیا مسلم لیگ ہر دو سیاسی جماعتوں کے بانیان وہی زعماء ہو سکتے تھے جنہیں حکومتِ وقت اپنا دُشمن سمجھنے کی بجائے اپنا دوست اور رہنما سمجھتی تھی۔ سیاسی جماعتیں بھی ہر دور میں بدلتی ہوئی سیاسی زندگی کے

زیرِ اثر نشو وارتقاء کے مراحل سے گزرتی ہیں اور رفتہ رفتہ اُس مرحلے پر پہنچ جاتی ہیں جب ان کی قیادت اہلِ اقتدار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنا حق حاصل کر لیتی ہے۔ انڈین نیشنل کانگرس اور آل انڈیا مسلم لیگ ہر دو سیاسی جماعتوں نے وفاداری سے بغاوت تک کا ارتقائی سفر یکساں انداز میں طے کیا تھا۔

جناب جسونت سنگھ نے اپنے من پسند نتائج تک پہنچنے کی خاطر شملہ وفد اور مسلم لیگ کے قیام کو درست تاریخی تناظر سے کاٹ کر پیش کیا ہے۔ اگر وہ ہندو جارحیت کی تحریک کا مذکورہ بالا تاریخی سیاق وسباق بھی پیشِ نظر رکھتے تو وہ تاریخی حقائق سے برآمد ہونے والی سچائیوں سے روگردانی کے مرتکب نہ ہوتے۔ تب اُنہیں شملہ وفد اور آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام برطانوی سرکار کے ارشاد کی تعمیل (Command Performance) کی بجائے اسلامیانِ ہند کے تحفظ اور بقاء کی تحریک کا نقطۂ آغاز نظر آتا۔ جناب جسونت سنگھ کی زیرِ نظر کتاب تاریخ کے اوراق کی ایسی ہی من مانی کانٹ چھانٹ کا شاہکار ہے۔

قائداعظم، گاندھی جی مذاکرات کی کہانی

بیسویں صدی کی چوتھی دَہائی میں قائداعظم گاندھی جی مذاکرات کی ناکامی کے اسباب کا تجزیہ کرتے وقت جناب جسونت سنگھ نے گاندھی جی کے عقیدت مند پیروکار اور سوانح نگار پیارے لال کی کتاب میں شامل گاندھی جی کے بیانات پر انحصار کیا ہے۔ بمبئی کی ۱۰۔ ماؤنٹ پلیزنٹ روڈ پر واقع قائداعظم کی رہائش گاہ پر ۹ ستمبر ۱۹۴۴ء کو شروع ہو کر اٹھارہ دِن تک جاری رہنے والے اِن مذاکرات کی ناکامی کا سبب ہر دو لیڈروں کی اپنے اپنے سیاسی مؤقف پر ثابت قدمی ہے۔ پیارے لال کی ڈائری بعنوان *The Final Phase* کے تمام تر مندرجات صرف گاندھی جی کے بیانات پر مشتمل ہیں۔ گاندھی جی نے اپنے ذہن میں جس تصوّر کو راسخ کر کے مذاکرات کی اِس کہانی (۹ ستمبر ۱۹۴۴ء۔ ۲۷ ستمبر ۱۹۴۴ء) کا آغاز کیا تھا اُسے خود انھوں نے درج ذیل الفاظ میں بیان کرنا مناسب سمجھا ہے:

> "I am to prove from his own mouth that the whole of the Pakistan proposition is absurd."[۸]

کتاب کے مترجمین نے اوپر دیئے گئے جملے کا ترجمہ یوں کیا ہے: ''پاکستان کی یہ ساری تجویز ہی بکواس ہے'' (صفحہ ۲۳۴)۔ یہاں اِس بات کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اِن مذاکرات پر ہندو مہاسبھا نے شدید غیض وغضب کا اظہار کیا تھا۔ یہ نادان اِس حقیقت سے بے خبر تھے کہ تصورِ پاکستان کی حد تک ہندو مہاسبھا اور گاندھی جی کا مؤقف ایک تھا۔ ہندو مہاسبھا اسلامیانِ ہند کی خودمختاری کی ہر تجویز پر غیض وغضب کے اظہار کی خوگر تھی جبکہ گاندھی جی اپنی عیّار عقل کے گھوڑے دوڑا کر تصورِ پاکستان کو ''بکواس'' ثابت کرنے میں مصروف تھے۔ چنانچہ مذاکرات کے دوران گاندھی جی مُصر رہے کہ پہلے کانگرس اور مُسلم لیگ کی مشترکہ حکمتِ عملی سے برصغیر آزاد کرایا جائے اور پھر آزاد برصغیر میں ہندو مسلم بھائی بھائی بن کر علاقائی تقسیم کا مسئلہ حل کریں۔ اِس کے برعکس قائداعظم کا مؤقف یہ تھا کہ پہلے مسلمانوں کے قومی حقِ خود ارادیت کا اثبات کیا جائے اور پھر برطانوی سامراج کو برعظیم سے نکال باہر کرنے کے لیے مشترکہ جدوجہد کی جائے۔ ہر دور ہنما از اوّل تا آخر اپنے اپنے مؤقف پر قائم رہے اور یوں یہ مذاکرات بے نتیجہ ثابت ہوئے۔ مذاکرات کے دوران جب گاندھی جی نے تصوّرِ پاکستان کے خلاف اپنے استدلال میں لفظ ''پاکستان'' کی قرارداد لاہور میں عدم موجودگی کی دلیل پیش کی تو قائداعظم نے وضاحت فرمائی:

"'The word has now become synonymous with the Lahore resolution.... We maintain and hold that Muslims and Hindus are two major nations by any definition or test of a nation.' Muslims were a separate nation by virtue of thier 'distinctive culture and civilisation, language and literature, art and architecture, names and nomenclature, sense of value and proportion, legal laws and moral codes, customs and calendar, history and tradition', and, therefore, they were entitled to a separate, soverign existence in a homeland of their own."[۹]

گاندھی جی کی ہٹ دھرمی کا اندازہ اِس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ جب بات چیت کے آغاز میں قائداعظم نے گفتگو کا آغاز سن چالیس کی قراردادِ پاکستان پر بحث سے کرنا چاہا تو گاندھی جی نے فرمایا کہ میں تو اِس قرارداد سے ناواقف ہوں۔ میں نے تو یہ قرارداد ابھی تک پڑھی ہی نہیں۔ اِن طول طویل مذاکرات کے دوران گاندھی جی کے استدلال سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں نظر آتی ہے کہ انھوں نے نہ صرف قراردادِ پاکستان پڑھ رکھی تھی بلکہ اِس پر خوب غور و فکر بھی کر رکھا تھا۔ اِس کا سب سے بڑا ثبوت جداگانہ مسلمان قومیت کے حق میں قائداعظم کے استدلال کو انھوں نے یہ کہہ کر رَد کر دیا تھا کہ برطانوی ہند دو یا دو سے زیادہ قوموں کا مسکن نہیں بلکہ مختلف الخیال اور مختلف الالوان افراد پر مشتمل ایک ہی خاندان کا وطن ہے۔ اکھنڈ بھارت کے اِس تصور کو رَد کرتے ہوئے قائداعظم نے پُرزور اصرار کیا تھا کہ گاندھی جی کو چاہیے کہ وہ پہلے جداگانہ مسلمان قومیت پر مبنی دوقومی نظریے کو دل سے تسلیم کریں اور پھر اپنی بات کو آگے بڑھائیں:

"Jinnah insisted that Gandhi should accept the 'basic and fundamental principles' adumberated in the Lahore resolution. Gandhi pleaded with him that it was not necessary since he had accepted 'the concrete consequence' that would follow from such acceptance in as far as it was reasonable and practicable? 'I cannot accept the Lahore resolution as you want me to, especially when you seek to introduce into its interpretation theories and claims which I cannot accept and which I cannot ever hope to induce India to accept'.

'Can we not agree,' Gandhi finally pleaded, 'to differ on the question of 'two-nations' and yet solve the problem on the basis of self-dertermination?'"[۱۰]

اِن دو عظیم شخصیات کے مابین درج بالا مکالمات پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ گاندھی جی برطانوی

ہند میں دو یا دو سے زیادہ قوموں کے وجود سے انکاری ہیں۔ انتہائی مجبوری کے عالم میں بھی وہ قائداعظم کو نظریاتی خودمختاری کی بجائے علاقائی خودمختاری پر اتفاق کر لینے کا مشورہ دیتے ہیں۔ دوقومی نظریہ کو وہ کسی بھی صورت میں قبول کرنے پر تیار نہیں۔ قائداعظم کو وہ فقط اتنی سی پیش کش کرنے پر تیار ہو پاتے ہیں کہ اگر وہ دوقومی نظریے سے دستبردار ہو جائیں تو اُنھیں مخلوط انتخابات کے ذریعے علاقائی خودارادیت کا حق دیا جا سکتا ہے۔

اِن مذاکرات کی ناکامی کا سبب یہ ہے کہ گاندھی جی پاکستان کی نظریاتی بنیاد کو مٹانے کو کارِ ثواب سمجھتے ہیں جب کہ قائداعظم پاکستان کی نظریاتی بنیاد کے استحکام میں کوشاں ہیں۔ پاکستان کے نظریاتی وجود کو مٹا ڈالنے کی یہ حکمتِ عملی قیامِ پاکستان کے بعد بھی جاری رہی۔ قیامِ پاکستان کے بعد دوقومی نظریے کو فراموش کر دینے کے حق میں مہاتما گاندھی کی دلیل یہ ہے کہ یہ نظریہ تو پاکستان کے قیام کی خاطر وضع کیا گیا تھا اب چوں کہ پاکستان کا تصوّر یعنی دوقومی نظریہ ایک ٹھوس جغرافیائی حقیقت بن چکا ہے اِس لیے دوقومی نظریہ کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اِس باب میں قائداعظم کے طرزِ فکر و عمل کو سمجھنے کے لیے چودھری خلیق الزمان کی کتاب "Pathway to Pakistan" کے آخری صفحات کا مطالعہ مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ ۳۹۰ سے لے کر ۴۰۰ صفحات تک حسین شہید سہروردی اور چودھری خلیق الزمان پر گاندھی کے زیرِ اثر دو قومی نظریے کی تباہ کاریاں آشکار دکھائی گئی ہیں۔ ہر دو زعما قیامِ پاکستان کے بعد گاندھی جی کی دستخط شدہ ایک دستاویز لے کر قائداعظم کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور گاندھی جی کا یہ پیغام پہنچاتے ہیں کہ اگر اِس دستاویز پر میرے دستخطوں کے ساتھ قائداعظم کے دستخط بھی ثبت ہو جائیں تو اِس کی اشاعت سے پاکستان اور بھارت میں فرقہ وارانہ فسادات ختم ہو جائیں گے۔ قائداعظم ایسا کرنے سے انکار کر کے ایک بار پھر دوقومی نظریہ کی ابدی صداقت پر اپنے ایمانِ محکم کا اظہار کرتے ہیں۔ بانیِ پاکستان بابائے قوم کے نزدیک دوقومی نظریہ قیامِ پاکستان کے بعد بھی زندہ ہے اور اِس پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔

قائداعظم کی نظریاتی استقامت اور صلابتِ فکر اپنی جگہ مگر سوال یہ ہے کہ گاندھی جی اپنے دمِ واپسیں تک دوقومی نظریے سے کیوں خائف رہے؟ فقط اِس لیے کہ دوقومی نظریہ فی الحقیقت برطانوی ہند میں آباد کئی قوموں کے حقِ خودارادیت کا نظریہ ہے۔ جب تک یہ نظریہ زندہ ہے موجودہ بھارت کی حدود میں آباد کوئی بھی قوم اِسی نظریے کی بُنیاد پر اپنے لیے الگ وطن کے حصول کی تمنّا کو تحریک کی اور تحریک کو اپنے آزاد اور خودمختار وطن کے قیام کی بنیاد بنا سکتی ہے۔ فقط چار پانچ سال پیشتر بھارت کے اچھوتوں نے بھارت کے یومِ جمہوریہ (۲۰۰۵ء) پر شہر میرٹھ کے سب سے بڑے پارک میں پاکستان کا قومی پرچم اور پاکستان زندہ باد کے پوسٹر لہرا کر اچھوت قوم کے لیے قائداعظم کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ایک جداگانہ مملکت کے قیام کا مطالبہ کر دیا تھا۔ یہ تو ابھی کل ہی کی بات ہے کہ آندھرا پردیش میں آزاد اور خودمختار تلنگانہ ریاست کے قیام کی تحریک کی پہلی منزل سر کر لی گئی ہے۔ مغربی بنگال میں گورکھالینڈ کے قیام کی تحریک نے ایک بار پھر زور پکڑ لیا ہے۔ ''انڈیا آفٹر گاندھی'' کے مصنف، نامور مؤرخ رام چندر گوہا نے ابھی چند روز پیشتر دعویٰ کیا ہے کہ:

> "We are an evolving nation, we are 60 years young. We are yet to find the correct political forms to cope with our growing population."[11]

گاندھی جی سے لے کر جسونت سنگھ تک بھارت کی سامراجی وحدت کے ثناخواں سیاسی مدبر، تصوّرِ پاکستان (دوقومی نظریہ:

برطانوی ہند ایک ملک نہیں، ایک برِّعظیم ہے جس میں ایک نہیں، کئی قومیں آباد ہیں) سے ترساں و لرزاں چلے آ رہے ہیں۔ تحریکِ پاکستان کے دوران انھوں نے قیامِ پاکستان کی ہر ممکن حد تک مخالفت کی اور بعدازاں قیامِ پاکستان کے بعد پاکستانی قوم کے دل و دماغ سے تصوّرِ پاکستان کو محو کر ڈالنے کی ہر تدبیر آزمائی۔ جسونت سنگھ کی زیرِ نظر کتاب بھی تصورِ پاکستان کو جھٹلانے کی ایک کوشش ہے۔ یہ لوگ خوب جانتے ہیں کہ تصورِ پاکستان کو دھندلاتے دھندلاتے بالآخر مٹا ڈالنے کے بعد پاکستان کا جغرافیائی وجود بھی رفتہ رفتہ منتشر ہو کر رہ جائے گا۔ ہمیں بھی جان لینا چاہیے کہ ہماری قومی بقا اور ہمارا قومی ارتقاء پاکستان کے تصور اور پاکستان کی حقیقت کی یکدلی، حرف و معنی کی یکجائی پر منحصر ہے۔

پاکستان کی نظریاتی اساس سے خوف کیوں؟

گاندھی جی اور جواہر لال نہرو سے لے کر جسونت سنگھ تک ہندوستان کے سرکردہ سیاسی دانشور پاکستان کی نظریاتی اساس سے خائف چلے آ رہے ہیں۔ یہ لوگ تصورِ پاکستان کی نفی کرنے کی خاطر عہد آفریں تاریخی حقائق سے چشم پوشی پر مجبور ہیں۔ اقبال کے انقلابی سیاسی افکار سے تحریکِ پاکستان کے ناگزیر رشتے کو توڑنے کی مہم کا آغاز خود گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا تھا۔ قائداعظم اور گاندھی جی کے درمیان اٹھارہ روزہ مذاکرات کے دوران گاندھی جی نے جداگانہ مسلمان قومیت یعنی دوقومی نظریہ کی بجائے فقط جغرافیائی حقائق پر مبنی سیاسی حل تلاش کرنے پر بار بار زور دیا تھا اور ہر بار قائد نے اِس استدلال کو پوری قوّت کے ساتھ رَد کر دیا تھا۔ پنڈت نہرو نے اپنی کتاب ''تلاشِ ہند''(Discovery of India) میں اقبال کی شاعرانہ اور فلسفیانہ خدمات کو بھرپور خراجِ تحسین پیش کرتے وقت اِس جھوٹ کو سچ بنا کر پیش کرنے کی ناکام کوشش کر رکھی ہے کہ علامہ اقبال کا تصوّرِ پاکستان سے کوئی تعلق نہ تھا۔ آج جناب جسونت سنگھ ہمیں سمجھانے آئے ہیں کہ قائداعظم کو اسلامی ریاست کے قیام سے کوئی غرض نہ تھی وہ تو فقط مسلم علاقہ (Muslim Territory) حاصل کرنا چاہتے تھے۔ یہاں میں قارئینِ کرام کی توجہ اِس حقیقت کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ برصغیر میں مسلمان اکثریت کے خطّے تو پہلے سے موجود تھے۔ تحریکِ پاکستان کے قائداعظم تو اِن خطّوں میں مثالی اسلامی مملکت کے قیام کی خاطر جہد آزما تھے۔ تصورِ پاکستان کے خالق علامہ اقبال کو تصوّر اور تحریک ہر دو سے لاتعلق ثابت کرنے کی یہ مہم درحقیقت ہمیں علامہ اقبال کے فکری اور نظریاتی فیضان سے محروم کر دینے کی نامبارک مہم ہے۔ گاندھی جی اور پنڈت نہرو سے لے کر جسونت سنگھ تک سبھی یہ جانتے ہیں کہ بقول اقبال:

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

یہ لوگ ہماری جھولی میں فقط چند پتھر کنکر ڈال کر ہم سے اقبال کے وہ افکارِ تازہ چھین لینا چاہتے ہیں جن سے پاکستان کی جغرافیائی حدود کے اندر ایک جہانِ نو پیدا ہو سکتا ہے۔ جناب جسونت سنگھ نے زیرِ نظر کتاب میں مکمل حقائق کو تاریخ کے وسیع تر تناظر میں دیکھنے اور سمجھنے کی بجائے تاریخ کے طویل دورانیے میں سے فقط چند من پسند جزوی حقائق کو اپنے سیاق و سباق سے کاٹ کر پیش کیا ہے۔ میں اِس طرزِ عمل کو حقائق سے روگردانی کے مترادف سمجھتا ہوں۔ قائداعظم کا دعویٰ ہے کہ سن چالیس کی قراردادِ پاکستان مسلمان عوام کی اُس اجتماعی رائے سے پھوٹی ہے جسے اقبال کے فکر و فن کے فیضان نے جنم دیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اقبال کی فکر میں حضرت مجدد الف ثانیؒ، حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور سرسیّد احمد خاںؒ کے سے دردمندانِ ملّت کی عہد در عہد سفر کرتی ہوئی فکر شامل ہے۔ اقبال کے ضمیر میں یہ تمام فکری دھارے ایک منجدھار کی صورت

اختیار کرتے ہیں اور عصرِ حاضر کے سیاسی اور تہذیبی تصورات کے تناظر میں ایک نئی تشکیل پاتے ہیں۔ سن تیس کے خطبۂ الہ آباد میں پاکستان کا تصور اِسی نئی نظریاتی تشکیل کا عکس ہے۔

قراردادِ پاکستان کو تصورِ پاکستان کے تناظر میں ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ اِسی طرح تحریکِ پاکستان تصورِ پاکستان ہی کا عملی ظہور ہے۔ گاندھی جی کے سے جو دانشور یا سیاستدان تصورِ پاکستان کو ''بکواس'' یا ''بیہودہ'' یا "absurd" سمجھتے رہے وہ زندگی بھر احمقوں کی جنت ہی میں مقیم رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال اور قائداعظم کی اٹوٹ نظریاتی رفاقت اور فکری یگانگت کو سمجھے بغیر قیامِ پاکستان کے محرکات وعوامل کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ قائداعظم کے سیکرٹری مطلوب الحسن سیّد نے اپنی انگریزی تصنیف ''محمد علی جناح۔ ایک سیاسی مطالعہ'' میں لکھا ہے کہ قراردادِ پاکستان کی منظوری کے بعد قائداعظم نے اُن سے کہا تھا کہ ''کاش اقبال آج زندہ ہوتے! وہ یہ جان کر بہت خوش ہوتے کہ ہم نے بالکل وہی کیا ہے جس کی وہ ہم سے توقع رکھتے تھے''۔ ۱۲

سن انیس سو پینتیس کے قانونِ آزادیٔ ہند کے تحت منعقدہ اُنیس سو سینتیس کے انتخابات کے آس پاس کا زمانہ قائداعظم کی سیاسی زندگی کا انتہائی مُشکل زمانہ تھا۔ اِس کٹھن دور میں علامہ اقبال نے انتہائی استقامت کے ساتھ قائداعظم کا ساتھ دیا۔ اس دور میں اقبال اور قائداعظم کی عیاں اور نہاں قربت کی تفصیلات ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کی کتاب ''اقبال کے آخری دو سال'' میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دور ونزدیک سے کسی ادبی انجمن یا سیاسی تنظیم کی جانب سے اقبال کی صحت یابی کے لیے کسی دُعائیہ قرارداد کا پیغام پہنچتا تو اقبال فوراً تار کے ذریعے اپنی اِس تمنّا کا اظہار کرتے کہ 'اب میری بجائے قائداعظم کی درازیٔ عُمر کی دُعا کیا کریں۔ میں نے اپنا مشن مکمل کر لیا ہے مگر میرے قائداعظم کو ابھی اپنا مشن مکمل کرنا ہے'۔ اِسی زمانے میں ایک شام پنڈت نہرو میاں افتخار الدین کے ہمراہ علامہ اقبال کے ہاں تشریف لائے۔ گفتگو کے دوران جب یہ کہا گیا کہ اگر قائداعظم کی بجائے اقبال اسلامیانِ ہند کی سیاسی قیادت کا فریضہ سرانجام دیں تو کانگرس کے ساتھ مسلمانوں کے خوشگوار تعلقات قائم ہو سکتے ہیں۔ یہ بات اقبال کو سخت ناگوار گزری۔ انھوں نے بیساختہ فرمایا کہ 'صرف اور صرف محمد علی جناح ہی مسلمانوں کے لیڈر ہیں۔ میں اُن کا ایک ادنیٰ سپاہی ہوں'۔ تاریخ شاہد ہے کہ اقبال نے تاریخ کے اِس نازک ترین دور میں قائداعظم کے ایک وفادار سپاہی ہی کا کردار سرانجام دیا ہے۔ وہ اپنی آخری سانس تک قائداعظم کے ساتھ ایک چٹان کی طرح قائم رہے۔

جب قائداعظم اپریل سن انیس سو چھتیس میں میاں احمد یار خان دولتانہ، سر فضل حسین اور دیگر یونینسٹ سیاستدانوں سے مایوس ہو کر علامہ اقبال کے پاس آئے اور سیاسی مدد طلب کی تو اقبال نے بخوشی میدانِ عمل میں آنے کا وعدہ کیا۔ اِس موقع پر اقبال اور قائداعظم کے درمیان جو گفتگو ہوئی اُس میں سے فقط ایک سوال اور ایک جواب قارئینِ کرام کی نذر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

اقبال: ''اگر آپ اودھ کے تعلقہ داروں یا بمبئی کے کروڑ پتی سیٹھوں کی قسم کے لوگ پنجاب میں تلاش کریں گے تو یہ جنس میرے پاس نہیں ہے۔ میں صرف عوام کی مدد کا وعدہ کر سکتا ہوں۔

قائداعظم: مجھے صرف عوام کی مدد درکار ہے۔'' ۱۳

قائداعظم کے اِس عوام دوست مؤقف نے اقبال کی فکری اور نظریاتی تنہائی دُور کر دی۔ وہ خوشی سے چلّا اُٹھے: ''گئے دِن کہ تنہا تھا میں انجمن میں / یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں''۔ تب سے لے کر اپنے دمِ واپسیں تک اقبال نے قائداعظم کی سیاسی اور نظریاتی رفاقت

کا حق اِس شان سے ادا کیا کہ قائداعظم اُنہیں اپنا ''دوست، فلسفی اور رہنما'' کہنے لگے۔ سوشلزم کا دم بھرنے والے پنڈت نہرو ہمیشہ سے قائداعظم کے سیاسی قد وقامت سے خائف رہتے تھے اور جا و بے جا اپنے احساسِ کمتری کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ اپنی الیکشن مہم کے آغاز میں پنڈت جواہر لال نہرو نے انتہائی رعونت کے ساتھ اعلان کیا تھا کہ ''آج ہندوستان میں صرف دو فریق موجود ہیں۔ انڈین نیشنل کانگرس اور برطانوی حکومت۔ باقی جتنی جماعتیں ہیں اُن کو یا کانگرس کی پیروی کرنا پڑے گی یا برطانوی حکومت کا ساتھ دینا ہوگا۔'' اِس پر قائداعظم نے اعلان فرمایا کہ ''ہندوستان میں دو نہیں بلکہ تین فریق ہیں۔ نیشنل کانگرس، برطانوی حکومت اور مسلمان۔ ہم نہ کانگرس کے خیمہ بردار بننے کو تیار ہیں اور نہ حکومت کی کاسہ لیسی کرنے پر آمادہ ہیں۔ ہماری اپنی قومی پالیسی اور ہمارا اپنا قومی پروگرام ہے۔'' پنڈت نہرو قائد کے اِس بیان پر آپے سے باہر ہو گئے اور انھوں نے قائداعظم کی ذات اور مسلم لیگ ہر دو کو ہدفِ طعن بنایا۔ پنڈت نہرو کے اِس زہریلے بیان پر علامہ اقبال نے ایک طویل اور مدلل بیان جاری کیا جس کے فقط چند فقرے پیشِ خدمت ہیں:

> ''مسٹر جناح آج مسلمانوں کے سب سے بڑے اور سب سے معتمد علیہ لیڈر ہیں۔ مسٹر جناح تخیل کی دنیا میں پرواز کرنے کی بجائے حقیقت بینی کو ترجیح دیتے ہیں۔..... پنڈت نہرو کو یہ ہرگز زیب نہیں دیتا کہ وہ اِس بات کا شور مچاتے پھریں کہ مسٹر جناح مسلمانوں کے متوسط درجے کے بالائی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں یا مسٹر جناح کو مسلمانوں کے افلاس اور فاقہ زدگی کا کوئی علم نہیں ہے، یا یہ کہ (پنڈت نہرو) ہندوؤں اور مسلمانوں کی یکساں نمائندگی کرتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا خود پنڈت نہرو ہندوؤں کے متوسط طبقے کے بالائی اور متموّل طبقے سے تعلق نہیں رکھتے؟ افلاس اور بھوک کا نام لے لے کر خلطِ مبحث کرنے اور ماسکو سے مانگی ہوئی زبان میں باتیں کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ ضرورت اِس امر کی ہے کہ حقائق کو بنظرِ غائر پرکھا جائے .....مسلمانوں کی طرف سے اگر کسی شخص کو بات کرنے کا حق حاصل ہے تو وہ صرف مسٹر جناح ہیں۔''[۱۴]

انتخابات کے نتائج برآمد ہوتے ہی پنڈت نہرو نے ۱۹ مارچ ۳۷ء کو دہلی میں ایک آل انڈیا نیشنل کنونشن منعقد کی جس میں اپنی تقریر کے دوران انھوں نے اِس بات پر بہت زور دیا کہ مسلمانوں کو کوئی معقول قیادت میسر نہیں آئی۔ چنانچہ مسلمان آج اُداس اور مغموم ہیں۔ وہ خود کو ''لاوارث سمجھنے لگے ہیں''۔ چناں چہ اب انڈین نیشنل کانگرس ہی مسلمانوں کی قیادت کا فرض سنبھال رہی ہے۔ اِسی کنونشن میں الہ آباد میں سوشلسٹ دانشور ڈاکٹر محمد اشرف کی نگرانی میں ''مسلم رابطۂ عوام'' کے قیام کا اعلان کیا گیا۔ علامہ اقبال نے کانگرس کی اِس جارحانہ مہم کا مقابلہ کرنے کی حکمتِ عملی اور ٹھوس منصوبہ بندی کو قائداعظم کے نام اپنے خطوط میں صیغۂ راز میں رکھتے ہوئے پیش کیا ہے۔ قائداعظم نے اِس حکمتِ عملی پر حرف بہ حرف عمل کرتے ہوئے آل انڈیا مسلم کنونشن منعقد کیا اور اُس کنونشن میں جداگانہ مسلمان قومیت کو اُجاگر کرتے ہوئے اسلامیانِ ہند کے جداگانہ تہذیبی، معاشی اور سیاسی مؤقف پر اصرار کیا۔ اِس زمانے میں اقبال نے اپنے بسترِ علالت اور بعد ازاں بسترِ مرگ سے اُٹھ اُٹھ کر مسلم لیگ کی روز افزوں سیاسی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیا۔ اقبال کی سیاسی اور تہذیبی خدمات کو اس سے بڑا خراجِ تحسین کیا ہوگا کہ سن انیس سو چالیس کی جس صبح قراردادِ پاکستان منظور ہوئی اُسی شام لاہور میں یومِ اقبال کی تقریبات کا آغاز ہوا۔ تقریب کے پہلے اجلاس کی صدارت شیرِ بنگال فضل حق نے فرمائی اور اپنے صدارتی خطبے میں قراردادِ پاکستان کو فکرِ اقبال کی عطا قرار دیا۔ دوسرے اجلاس کی صدارت خود قائداعظم نے فرمائی اور اپنے صدارتی کلمات میں قراردادِ پاکستان کو اقبال کے سیاسی شعور کا اعجاز ٹھہرایا اور اپنے صدارتی کلمات میں اعلان

فرمایا کہ:

"If I live to see the ideal of a Muslim State being achieved in India, and I were then offered to make a choice between the works of Iqbal and rulership of the Muslim State, I would prefer the former."[۱۵]

درج بالا سطروں میں بابائے قوم، بانیٔ پاکستان، قائداعظم محمد علی جناح نے علامہ اقبال کے ساتھ اپنی ذاتی اور نظریاتی یگانگت کا ناقابلِ تردید ثبوت پیش کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اگر پاکستان میں مجھ سے پاکستان کی حکمرانی یا اقبال کے فکر و تخیّل میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب کرنے کو کہا گیا تو میں حکومت چھوڑ دوں گا مگر اقبال کے افکار سے اپنا رشتہ ہرگز نہ توڑوں گا۔ بابائے قوم اِس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ اقبال کے افکارِ تازہ پر عمل کے بغیر نہ پاکستان وجود میں آ سکتا ہے اور نہ پاکستان کی جغرافیائی حدود کے اندر ایک جہانِ تازہ نمودار ہو سکتا ہے۔ افسوس صد افسوس! قائداعظم کی رحلت کے بعد ہمارے حکمران طبقے نے رفتہ رفتہ بابائے قوم کا طرزِ فکر و عمل ترک کر دیا۔ اپنی کرسی کو مضبوط کرنے کی خاطر اقبال کو چھوڑ دیا۔ نتیجہ یہ کہ نہ کرسی مضبوط رہی اور نہ ہی پاکستان!

سیکولر مُلّائیت اور ہندو انتہا پسندی کے مقاصد ایک ہیں

'عیبِ مے جملہ بگفتی، ہنرش نیز بگو' کے مصداق جناب جسونت سنگھ کی کتاب کی سب سے بڑی خوبی کی تحسین بھی ہم پر واجب ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں پنڈت جواہر لال نہرو کے ذہن و ذوق کا حقیقت افروز تنقیدی تجزیہ بھی پیش کیا گیا ہے اور برعظیم کی سیاست پر پنڈت جی کے سیکولر طرزِ فکر و عمل کے منفی اثرات کو بھی اُجاگر کیا گیا ہے۔ اِس باب میں اُن کا بنیادی سوال یہ ہے کہ اگر پنڈت نہرو واقعتاً سیکولر تھے تو پھر انھوں نے مذہب یعنی جداگانہ مسلمان قومیت کی بنیاد پر ہندوستان کی تقسیم کیوں قبول کر لی تھی؟ جناب جسونت سنگھ نے اِس سوال کے جواب میں قائداعظم کی دیوقامت شخصیت کے سامنے پنڈت نہرو کے مریضانہ احساسِ کمتری کا بیّن ثبوت خود پنڈت نہرو کی احمد نگر جیل میں سن انیس سو تینتالیس میں قلمبند کی گئی ڈائری سے اخذ کیا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے قائداعظم کا خیال آتے ہی پنڈت جی کے جسم و جاں پر غیض و غضب کی کپکپاہٹ طاری ہو جاتی ہے اور وہ خود میں قائداعظم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی ہمت نہ پا کر پکار اُٹھتے ہیں کہ قائداعظم سے نجات کی خاطر اگر پاکستان کا قیام منظور کرنا پڑے تو بھی کر لینا چاہیے:

"Instinctively I think it is better to (give) Pakistan or almost anything if only to keep Jinnah far away and not allow his muddled and arrogant head from interfering continually in India's progress."[۱۶]

جناب جسونت سنگھ نے پنڈت نہرو کی اِس قابلِ رحم نفسیاتی بیماری کا تجزیہ کرتے وقت دیگر سیاسی مؤرخین کے اخذ کردہ نتائج سے بھی استفادہ کیا ہے۔ انہی سیاسی مؤرخین میں سے ایک Leonard Moseley ہیں جن کی پنڈت نہرو کے ساتھ ایک گفتگو کا حوالہ دیا گیا

ہے۔ اِس گفتگو کے دوران پنڈت جی اعتراف کرتے ہیں کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ تقسیم ہند عارضی ثابت ہوگی اور بالآخر پاکستان کا بھارت کی گود میں آ گرنا لازم ہے:

"We expected that Partition would be temporary, that Pakistan was bound to come back to us."[۱۷]

پنڈت نہرو کا یہ اعتراف بہت معنی خیز ہے کہ انھوں نے قیامِ پاکستان کو ایک ابدی حقیقت کی بجائے فقط ایک عارضی اور فانی حقیقت سمجھ کر قبول کیا تھا۔ کیا عجب قیامِ پاکستان کے فوراً بعد پاکستان سے دشمنی کا چلن، کشمیر پر بھارت کی فوج کشی اور پنجاب میں فسادات پاکستان کو جنم لیتے ہی موت کی نیند سُلا دینے کی حکمتِ عملی کا شاخسانہ ہو۔ جناب جسونت سنگھ پنڈت نہرو کو پاکستان کی اِن ابتدائی مشکلات و مصائب کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں:

"The Congress, led by Nehru, was the political party that agreed to partition; then later as the occupant of the seat of authority, and as the head of government of the day, he was clearly guilty of failing totally in his duty of preventing the bloodshed of millions of innocents. The fratricidal killing was of such unprecedented dimensions that the blood that then soaked our land continues till today to entrap Hindu-Muslim relations into congealed animosities."[۱۸]

فسادات کی ذمہ داری کا یہ تعین اِس اعتبار سے حقائق پر مبنی ہے کہ اگست سن انیس سو سینتالیس میں پنڈت نہرو وزیراعظم، سردار پٹیل وزیرِ داخلہ، سردار بلدیو سنگھ وزیرِ دفاع اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن گورنر جنرل تھے۔ امن و امان کے قیام اور جان و مال کے تحفظ کی ذمہ داری انھی لوگوں پر عائد ہوتی تھی۔ پنڈت نہرو اِن کے سربراہ تھے۔ اِن لوگوں کو سخت مجبوری کے عالم میں قیامِ پاکستان کا مطالبہ منظور کرتے ہی بنی تھی۔ آخری وار کے طور پر انھوں نے پاکستان کو ''کٹا پھٹا اور دیمک خوردہ'' پاکستان بنانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا۔ کیا اِن نامبارک مساعی کے پسِ پردہ یہ مقصد کارفرما تھا کہ پاکستان فسادات کے خون میں ڈوب کر رہ جائے اور یوں پنڈت نہرو کی یہ پیش گوئی سچ ثابت ہو کہ پاکستان کی ہندوستان میں از سرِ نو شمولیت ناگزیر ہے؟ کیا مختلف اور متنوع حربوں سے قیامِ پاکستان کے فوراً بعد پاکستان کو ختم کر دینے کی یہ منصوبہ بندی مسلمانوں کے دلوں سے تصورِ پاکستان کو محو کر دینے کی حکمتِ عملی تھی؟ اِن سوالات پر غور کریں تو کُھلتا ہے کہ جناب جسونت سنگھ اور پنڈت جواہر لال نہرو..... ہندو مہاسبھا اور انڈین نیشنل کانگرس..... کے مقاصد ایک ہیں، فقط حکمتِ عملی جداگانہ ہے۔

پنڈت نہرو قراردادِ پاکستان کے چار سال بعد اپنی کتاب Discovery of India میں ایک ایسے ہندوستان کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں جس کی مغربی سرحد ہندوکش کا پہاڑ ہے۔ جسونت سنگھ بھی اپنی زیرِ نظر کتاب میں برما سے افغانستان تک پھیلی ہوئی وسیع و عریض سلطنت کے رومانی خواب کے منتشر ہو کر رہ جانے پر سراپا وقفِ الم ہیں۔ وہ ہمیں قیامِ پاکستان پر اپنے دل میں بچھی ہوئی صفِ ماتم کی

جانب یوں متوجہ کرتے ہیں:

> "The Indian subcontinent, from Burma to Afghanistan had almost always been a natural 'common market' for the movement of goods and people. Partition was not just a geographical and emotional vivisection of this subcontinent, India in consequence clearly lost the most; its land and its people; plus its political, cultural and social unity was torn asunder, but then that was not of concern to the Quaid-e-Azam."[۱۹]

پنڈت نہرو اور جسونت سنگھ ہر دو کی متذکرہ بالا کتابوں کے اوراق پلٹتے وقت اُس قدیم ہندوستان کی ''ہولناک چیر پھاڑ'' پر نالہ و ماتم کی دبی دبی سسکیاں سُنائی دیتی ہیں جو برما سے افغانستان تک ایک وسیع و عریض منڈی کی مثال پیش کر رہا تھا۔ مگر یہ تو قرونِ وسطیٰ کا قصّہ ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے پنڈت نہرو اور جسونت سنگھ کی ذہنی ساخت پرداخت قرونِ وسطیٰ کی شہنشاہیت کی فضاؤں میں ہوئی ہو اور وہ اشوک سے لے کر اورنگزیب تک اور پھر اورنگزیب کے نااہل جانشینوں سے لے کر لارڈ ماؤنٹ بیٹن تک کی شہنشاہیت کو جمہوری لباس میں قائم ودائم رکھنا چاہتے ہوں۔

اگر پنڈت نہرو اور جسونت سنگھ اپنے دماغ سے شہنشاہیت کے خنّاس کو نکال کر اپنے ہمسایہ ممالک کی آزادی، خودمختاری اور خود ارادیت کا احترام کرنا سیکھ لیتے تو آج وہ اس طرح کی نالہ زنی سے نجات پا سکتے تھے۔ یورپ میں ایمپائر کے ٹوٹ جانے کے نتیجے میں جتنے ممالک آزاد ہوئے تھے وہ اوّل اوّل اپنے ہمسایہ ممالک سے جنگ آزما رہے۔ جرمنی اور فرانس میں تو چھوٹے موٹے سرحدی تنازعات پر برسوں جنگیں جاری رہیں۔ پھر وہ وقت آ پہنچا جب یہ تنازعات ختم کر کے یورپ کی تمام قومیں ایک دوسرے کے قریب آئیں اور رفتہ رفتہ یورپین یونین کی سی کامن مارکٹ قائم ہوگئی۔ برما سے افغانستان تک پھیلے ہوئے خطۂ ارض پر آباد مختلف آزاد اور خودمختار قومی ریاستوں کا وجود تسلیم کیے بغیر امن، انصاف اور آزادی کی فضا کی پیدائش اور پرورش ناممکنات میں سے ہے۔ پنڈت نہرو اور جسونت سنگھ جداگانہ مسلمان قومیت کے نظریہ کو ماننے سے اس لیے انکاری ہیں کہ یہ نظریہ صرف پاکستان ہی کی نہیں بلکہ برعظیم ہند کی متعدد دوسری قوموں کی نظریاتی اساس بھی ہے:

> "Acceptance of partition on grounds of faith, particularly when that is demanded on grounds of 'Muslims (being) a separate nation', endlessly will continue to give birth to more destructive minoritism, being politically contagious for India, tragically the birth of Pakistan does not end this debate."[۲۰]

جناب جسونت سنگھ نے درج بالا سطور میں جداگانہ مسلمان قومیت کے نظریے کو ایک سیاسی متعدی مرض سے تعبیر کیا

ہے۔سیاسیات کے علم میں Politically contagious ایک نئی اصطلاح ہے۔ میں جداگانہ مسلمان قومیت کے تصور کو انسانی آزادی کا منشور سمجھتا ہوں اور اِس کی بنیاد پر پاکستان کے قیام کو سلطانیٔ جمہور کی بارش کا پہلا قطرہ قرار دیتا ہوں۔ پنڈت نہرو ہوں یا جسونت سنگھ یا بھارت کی دیگر سیاسی قوتیں، ان میں سے کسی نے بھی قیامِ پاکستان کو دِل سے تسلیم نہیں کیا۔ یہ خبثِ باطن ہی پاکستان اور بھارت کے مابین مسلسل جنگ وجدل کا باعث چلا آ رہا ہے۔ جناب جسونت سنگھ نے قائداعظم محمد علی جناح کی نیّت کو اپنی نیّت کے آئینے میں یوں دیکھا ہے:

> "Muhammad Ali Jinnah was, to my mind, fundamentally in error proposing 'Muslims as a separate nation', which is why he was so profoundly wrong when he simultaneously spoke of 'lasting peace, amity and accord with India after the emergence of Pakistan'; that simply could not be."[۲۱]

درج بالا سطور میں ڈنکے کی چوٹ یہ اعلان کیا گیا ہے کہ پنڈت نہرو کی سیکولر مُلّائیت اور جسونت سنگھ کی ہندو احیائیت، ہر دو اُس وقت تک طبلِ جنگ پر چوٹ لگاتی رہیں گی جس وقت تک پاکستان جداگانہ مسلمان قومیت کی نظریاتی اساس پر قائم ہے۔ بھارت سے دوستی کی فقط ایک ہی شرط ہے کہ پاکستان اپنی نظریاتی بنیاد کو منہدم کر دے۔ پاکستان کی محکوم اشرافیہ تو شاید اس شرط کو قبول کر لینے پر آمادہ ہے مگر آزاد پاکستان کے غیور عوام کے نزدیک: ایں خیال است ومحال است وجنوں!

حوالہ جات

۱۔ روزنامہ ڈان، کراچی، ۲۵۔اپریل ۲۰۱۰ء

۲۔ Thoughts & Reflections of Iqbal، لاہور، ص ۱۸۸

۳۔ ۱۹۴۲ء، Letters of Iqbal to Jinnah، لاہور، ص ۶

۴۔ Jinnah India-Partition Independence، ص ۳۶۰

۵۔ ایضاً، ص ۳۶۰۔۳۹۱

۶۔ جناح اتحاد سے تقسیم، صفحہ ۳۶۷۔

۷۔ ۱۹۷۴ء، Bengal: The Nationalist Movement, 1876-1940، کولمبیا یونیورسٹی پریس، ص ۱۱۳۔۱۱۴

۸۔ Jinnah India-Partition Independence، ص ۳۱۷

۹۔ ایضاً، ص ۳۱۹

۱۰۔ ایضاً، ص ۳۲۰

۱۱۔ Daily Times, 18-12-2009، لاہور
۱۲۔ Muhammad Ali Jinnah: A Political Study، ص ۲۳، کراچی
۱۳۔ بٹالوی، عاشق حسین، اقبال کے آخری دو سال، لاہور، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۳۰۷
۱۴۔ ایضاً، صفحات ۲۷۔۳۷۱
۱۵۔ The Civil and Military Gazette، لاہور ۲۶ مارچ ۱۹۴۰ء ص ۲۰۷
۱۶۔ Jinnah India-Partition Independence، ص ۵۰۵
۱۷۔ The Last Days of British Raj، ص ۲۸۵
۱۸۔ Jinnah India-Partition Independence، ص ۵۰۳
۱۹۔ ایضاً، ص ۵۲۲
۲۰۔ ایضاً، ص ۴۷۹
۲۱۔ ایضاً، ص ۴۹۸

Abstract

This is a review article on the book "Jinnah India-Participation Independence" by Jaswant Singh, published in 2009. In this article Jaswant Singh's ideas about Jinnah and the partition of the sub-continent have been scholarly analyzed and refuted forcefully. The reviewer has emphasized the enmity and odium against the establishment of Pakistan reflected in the book and discusses the facts and spirit of Pakistan Movement. He insists that Pakistan was not an outcome of the "collected folly" as claimed by the author of this book. Rather Pakistan is the realization of the conscious efforts and dreams of millions of Muslims residing in the sub-continent.

A

DESCRIPTIVE CATALOGUE

OF THE

ORIENTAL LIBRARY

OF THE LATE

TIPPOO SULTAN OF MYSORE.

TO WHICH ARE PREFIXED,

MEMOIRS OF HYDER ALY KHAN,

AND HIS SON

TIPPOO SULTAN.

By CHARLES STEWART, Esq. M.A.S.

LATE MAJOR ON THE BENGAL ESTABLISHMENT,
AND PROFESSOR OF ORIENTAL LANGUAGES IN THE HONOURABLE EAST-INDIA COMPANY'S
COLLEGE AT HERTFORD.

CAMBRIDGE:

PRINTED AT THE UNIVERSITY PRESS;

AND SOLD BY LONGMAN, HURST, REES, AND ORME, PATERNOSTER ROW, LONDON.

1809.